اردو میں میر شناسی کی روایت: مابعد تذکرہ نگاری

ڈاکٹر محمد ساجد خان*

Abstract:

The most important Urdu poet is undoubtedly Mir Taqi Mir. Along with his works, his personality always attracted the scholars. The Tradition of Criticism and Reasearch on Mir is very vast and diverse. This article takes acount of one era of this Tradition. Some important critics are disscussed in detail here

.

میر تقی میر اردو شاعری میں خدائے سخن کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اپنے موضوعاتی تنوع، فنی پختگی اور شاعری کے روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے آشوب کو موضوع بنانے کی وجہ سے میر ہر عہد اور زمانے کا شاعر بن گیا ہے۔ اُن کی شاعری کا دھیما پن دراصل اُن کے شعری لب و لہجے کو مقبول اور رومانوی بنا دیتا ہے۔ میر تقی میر کی شخصیت، شاعری اور عہد تینوں پر اردو تنقید نے دل کھول کر لکھا ہے۔ اگرچہ اس تنقیدی سرمائے کا بیشتر حصہ تاثراتی، تعصّباتی اور مقلدانہ ہے۔ مگر پھر بھی میر شناسی کی روایت اپنے اندر کئی سوالات سموئے ہوئے ہے۔ میر شناسی کی یہ روایت تذکروں سے شروع ہو کر زمانہ موجود تک چلی آئی ہے۔ تذکروں میں میر تقی میر کے کلام اور شخصیت کو دو واضح رنگوں میں دیکھا گیا ہے۔ ایک رنگ اُن کی شخصی عادات کی بناء پر اُن کی شاعری کو کم مایہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے تذکرہ نویسوں کے ہاں زمانے کا تعصب اور پیشہ ورانہ رقابت بھی جھلکتی ہے۔ جبکہ دوسرا رنگ میر کی مدح سرائی کا ہے۔ دوسرا رنگ بھی میرؔ کے کلام کے تجزیاتی پہلو سے خال خال ہی منسلک ہو پاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میر شناسی کی روایت میں تجزیاتی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا ہے، زیرِ نظر مقالے میں میر شناسی کی روایت کا منتخب حصے کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعے کا آغاز تذکروں کی روایت کے آخری سرے ''آبِ حیات'' سے جوڑا

* شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

گیا ہے۔

آب حیات محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔ یہ تذکرے اور تاریخ کے درمیان کی چیز ہے۔ یہ پہلی دفعہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔اس کا شمار تذکروں میں ہوتا ہے۔اس کتاب نے تذکرہ نگاری کے فن کو ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔اس کتاب کا اہل ذوق نے پر جوش استقبال کیا۔اردو اور فارسی تذکرہ نگاری کی روایت میں اس پائے کی کتاب نہ تھی۔ یہ کتاب مکمل طور پر شاعری کی تاریخ بن گئی ہے۔اور ساتھ اس کے اسلوب میں افسانویت اور نظم کا رنگ ملتا ہے۔اس کتاب کی کشش کا ایک بڑا سبب اس میں شامل وہ حکایتیں اور لطیفے ہیں۔جن میں کچھ تو صحیح ہیں،لیکن بعض محض قیاس کی بناء پر لکھی گئی ہیں۔آب حیات کی تنقید پر بہت زیادہ شور بھی مچا۔آزاد کی تنقید کو جانبدارانہ کہا گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں تاریخی مغالطے ہیں۔آب حیات کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ جس میں کچھ ترامیم کی گئیں۔آزاد نے آب حیات کو موضوع اور مواد کے لحاظ سے دیباچے کے علاوہ پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔اگر چہ بعض لوگ آب حیات کی تنقید اور خاکہ نگاری سے مطمئن نہیں اور اس عدم اطمینان حالت کا معقول جواز بھی ان کے پاس ہے۔مگر اس میں بھی حقیقت ہے کہ آب حیات کو اردو ادب خصوصا شاعری کی تنقید میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری میں لکھتے ہیں:

> ''آب حیات اردو شاعری اور اردو ادب کے طویل سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہے جسے نظر انداز کر کے اردو میں تنقید یا تاریخ کا کوئی خاکہ مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا''۔(۱)

آب حیات میں تنقید میر کے بارے میں اکثر ناقدین غیر مطمئن ہیں اور کہتے ہیں کہ آزاد نے میر کے سلسلے میں تاریخی حقائق پر پردہ ڈالا ہے۔اور روائتوں اور افسانوں سے ان کی شخصیت کی تعمیر کی ہے۔خصوصا ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی کتاب ''نقد میر'' کے ایک مضمون میں اسی حوالے سے بحث کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انہوں نے میر پر تنقید کرتے ہوئے جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

> ''آزاد سے ہمیں جو گلہ وہ یہ نہیں کہ انہوں نے میر کو بے نقاب کیوں کیا بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے میر کے اصل رنگ طبیعت سے نقاب نہیں اٹھائے شاید انہوں نے میر کی افسردہ مزاجی کو پسند نہ کیا اور اسی وجہ سے ان سے بدظن تھے''۔(۲)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آب حیات میں میر کے متعلق جو تنقیدی و تحقیقی مواد ملتا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔آزاد نے میر کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔نہ ہی آباؤ اجداد کے بارے میں کوئی خاص بات کی ہے۔

''میر مخلص، محمد تقی نام خلف میر عبداللہ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ میر صاحب کو ابتداء سے شعر کا شوق تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انہوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر خاں صاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب، غرض کسی مسئلے پر بگڑ کر الگ ہو گئے''۔ (۳)

خان آرزو سے اختلاف کی وجہ کوئی معقول نہیں ہے۔ لیکن آزاد نے اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ آزاد نے میر کے ابتدائی حالات اور آباؤ اجداد کے متعلق اتنا کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد وہ میر کی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ بتاتے ہیں۔ آزاد نے میر کی بد دماغی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو یہ وراثتی طور پر ملی۔ جن سے اکثر نقاد اختلاف کرتے ہیں۔ خاص کر ان کی بد دماغی اور تنہائی پسندی پر کافی بحث ہوئی ہے۔ میر کی وفات اور تصنیفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اور سو برس کی عمر پائی۔ تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان غزلوں کے ہیں۔ رباعیاں مستزاد چند صفحے چار قصیدے منقبت میں اور ایک نواب آصف الدولہ کی تعریف میں چند مخمس اور ترجیع بند مناقب ہیں چند مخمس شکایت زمانہ ہیں جن سے بعض اشخاص کی ہجو مطلوب ہے۔ دو اسوخت ایک ہفت بند بہت سی مثنویاں تذکرہ نکات الشعراء شاعران اردو کے حال کا اب بہت کمیاب ہے''۔ (۴)

محمد حسین آزاد نے میر تقی میر کے شعری سرمائے کے حوالے سے بنیادی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کی۔ شاعری پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق نہ تھا۔ علی ہذا القیاس مرثیہ بھی دیوان میں نہیں غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب و یاس سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں''۔ (۵)

آزاد نے میر کی شاعری میں بہتر نشتروں والی بات سے بھی اختلاف کیا ہے۔ میر کی غزل کو اصول غزل کے لحاظ سے سودا کی غزل سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ آزاد نے میر کی مثنوی کے متعلق کافی اچھی رائے دی ہے اور لکھا ہے کہ مثنوی کے اصول میر صاحب کے قدرتی اصول واقع ہوئے ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی ڈاکٹر سید عبداللہ نے اختلاف کیا ہے۔ تمام مثنویوں کا موضوع اور مضمون کے لحاظ سے سرسری سا جائزہ لیا ہے۔ نکات الشعراء کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ میر کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''میر صاحب کی زبان شستہ کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ اکثر جگہ ایسے لگتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں۔ ان کا

کلام صاف کہے دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا ہے''۔(۶)

ان کی غزلوں کی بحروں کو کہیں شربت اور کہیں شیر وشکر قرار دیتے ہیں۔اسی طرح میر کی فارسی ترکیبوں اور ان کا اردو تراجم محاوروں کا استعمال کا ذکر بھی کرتے ہیں۔آزاد کی تنقید میر کا جائزہ لیا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ انہوں نے اگر چہ میر کی شخصیت اور عادات کے متعلق غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔اور تحقیق سے کام نہیں لیا۔اسی وجہ سے ان کے بعض بیانات سے ناقدین کو اختلاف ہے۔اسی طرح انہوں نے شاعری پر تبصرہ کے وقت بھی بعض اختلافی باتیں کی ہیں۔لیکن ان سب کے باوجود ان کا تبصرہ میر کی تنقید میں ایک بنیادی ماخذ ہے۔اور ان کی تنقید سے میر کے قارئین اور ناقدین پر نئے گوشے کھلتے ہیں۔ان کی تنقید مختصر مگر جامع ہے۔

کاشف الحقائق کے مصنف سید امداد امام اثر ۱۷/ اگست ۱۸۴۹ء کو ضلع پٹنہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اگر چہ انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔لیکن والد صاحب سے درس لیتے رہے۔انہوں نے کاشف الحقائق کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں ہیں۔جن میں انہوں نے مختلف افکار و خیالات پیش کئے ہیں۔کاشف الحقائق کئی جہتوں سے ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔کاشف الحقائق پہلی مرتبہ ۱۸۷۹ء میں مطبع سٹار آف انڈیا سے شائع ہوئی۔اس کا نام ''بہارستان سخن'' بھی ہے۔اس کتاب میں اکثر فنون لطیفہ اور اس کی اقسام پر بحث و تنقید ملتی ہے۔اس کتاب میں ان کی شاعری پر بحث و نظر بھی ملتی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے میر پر بھی ایک سرسری سا تبصرہ کیا ہے جو کہ کافی دلچسپ ہے۔اگر چہ میر کے متعلق کوئی تفصیلی مضمون نہیں ہے لیکن جامع انداز میں ان کی شاعری پر تبصرہ ہے۔البتہ ان کی زندگی یا حالات پر کوئی خاص بات نہیں ملتی۔میر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میر نام نامی آپ کا میر محمد تقی ہے۔لاریب، میر صاحب اردو کی سلطان المتغزلین ہیں۔اور استاد ناسخ کی عقیدت مندی ان کی جناب میں بے سبب نہ تھی''۔(۷)

میر صاحب کے متعلق ان کی شاعری کے متعلق سرسری سا جائزہ ہے۔ان کے دیوانوں میں سے انتخاب کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انتخاب کے ذریعے ایک اچھا دیوان مرتب ہوسکتا ہے۔ان کے منتخب کلام کو اردو کا خوبصورت ترین کلام کہتے ہیں۔اور ان کی فنی عظمت کے بھی قائل ہیں۔ان کی غزل گوئی کے متعلق کہتے ہیں۔

> ''میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ اور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔میر صاحب کی غزل سرائی تمام تر شاعری کا داخلی پہلو رکھتی ہے تب ہی تو ان کے کلام میں سوز و گداز، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی شوخی وغیرہ کی کیفیتیں کثیر پائی جاتی ہیں''۔(۸)

میر صاحب کو اپنے ہم عصر شعراء پر برتر دکھاتے ہیں اور ان کی کامیاب تقلید کو بھی نہیں مانتے کہ کوئی شاعر

ان کی پیروی نہیں کر سکا۔اس کے بعد میر تقی میر کا کچھ کلام منتخب کیا ہے۔جو کہ غزلوں پر مشتمل ہے۔

مولوی عبدالحق نے میر کے سلسلے میں میر کی سوانح ''ذکر میر'' کے ساتھ اپنا مقدمہ ۱۹۲۸ء میں چھاپا یہ مقدمہ اور سوانح انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع ہوا۔بعد میں انہوں نے اس مقدمہ کے ساتھ میر کے کلام کا ایک انتخاب شائع کرایا۔اس مقدمے میں انہوں نے میر کی شخصیت زندگی اور شاعری پر بحث کی ہے۔اس لئے تنقید میر کے سلسلے میں ان کا کام خاصا اہم ہے۔اور روایت تنقید میر میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔مولوی عبدالحق صاحب میر کے کلام کو اردو میں اسی طرح اہم سمجھتے ہیں۔جس طرح فارسی میں سعدی کا کلام ہے۔ان کے خیال کے مطابق میر تقی میر ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے۔مولوی صاحب میر کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی۔البتہ ان کے وطن میں وہی بات لکھی ہے کہ وہ اکبر آباد کے تھے اور والد کی وفات کے بعد دلی چلے گئے۔ان کے آباؤ اجداد اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا،صرف میر کے آباؤ اجداد کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میر صاحب کے بزرگ اپنے قبیلے کے ساتھ حجاز سے سرحد دکن پہنچے اور وہاں سے احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔مگر ان کے جدکلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا۔اس کے بعد میر کی دلی آمد اور وہاں پر میر کی گزر بسر کے متعلق وہی روائتی باتیں کہی ہیں۔جو تذکروں اور ان سے پہلے کے نقادوں کے ہاں ملتی ہیں۔میر صاحب اور خان آرزو کے اختلافات کو بھی موضوع بنایا ہے۔غرض یہ کہ میر صاحب کو غم زدہ اور دردمند شخص کے روپ میں دکھاتے ہیں۔اس کے بعد دلی کے اجڑنے کا منظر دلی سے میر کی محبت اور لکھنؤ میں میر کے احوال سے خاصی تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔میر کی لکھنؤ آمد کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لکھنؤ آنے سے پہلے میر صاحب کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی۔یہاں آئے تو لوگوں نے ان کے لیے آنکھیں بچھا دیں۔گویا میر صاحب کے آنے سے لکھنؤ کو بھاگ لگ گئے۔شعر وسخن میں جان پڑ گئی۔اور مشاعروں کی رونق بڑھ گئی۔یہ قبولیت اردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوئی تھی''۔**(۹)**

اس کے بعد میر صاحب کی عظمت کے اعتراف میں جن شاعروں نے شعر کہے ان کا تذکرہ اور ان شعروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔اور پھر میر کی اپنی رائے اپنے اشعار کے متعلق بیان کرتے ہیں۔میر کی شاعری کی خصوصیات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب،زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ان کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ان کی زبان کی فصاحت اور سادگی سوز و گداز مضامین کی جدت اور تاثیر یہ ایسی خوبیاں ہیں

جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ان کی شاعری عاشقانہ ہے۔لیکن
کہیں کہیں اخلاق اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ادا کر جاتے ہیں۔ان کا کلام
حسرت و ناکامی حرمان و مایوسی سے بھرا ہوا ہے''۔(۱۰)

اس طویل اقتباس میں مولوی عبدالحق کی رائے میر کے کلام کے بارے میں تقریباً مکمل ہے۔اگر چہ ان کی چند باتوں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔مثلاً ان کے خیال کے مطابق میر کی شاعری مایوسی اور حسرت سے بھری ہوئی ہے۔لیکن واقعتاً ایسا نہیں ہے۔میر کے ہاں نشاط اور شوخی بھی ملتی ہے۔زندگی کا ہنگامہ بھی ہے۔مولوی صاحب آزاد کی اس رائے کی تائید کرتے ہیں کہ میر صاحب کا منتخب کلام ہی عمدہ ہے ورنہ اس کے دواوین میں رطب و یابس بھی ہے۔وہ ان کے اسلوب کو سیدھا سادہ اور نیچرل قرار دیتے ہیں۔اس کے بعد چند اشعار لاتے ہیں اور ان کے فکری اور فنی حوالے سے تجزیے کرتے ہیں۔اور ان میں میر کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں۔آزاد کی اس رائے کی بھی حمایت کرتے ہیں کہ میر کی طبیعت قصیدہ لکھنے کے موافق نہ تھی۔پھر ان کی مثنویوں کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں۔میر کی مثنوی کو زبان کو وہ اتنا عمدہ قرار نہیں دیتے جتنا کہ ان کی غزل کی زبان کو اور ان کو ان مثنویوں میں قصے پن کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ مولوی صاحب نے میر کے بعد اور ان کے ہم عصر شاعروں کے وہ دعویٰ نہیں سنے جن میں ان شعراء نے میر کے تتبع کا دعویٰ کیا ہے۔لیکن مولوی صاحب کی اس بات سے بھی اختلاف ذرا مشکل ہے کہ میر کی شاعری کی تاثیر کتنے شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔آخر میں انہیں اس بات کی توقع ہے کہ میر کا کلام ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔اس کے بعد انہوں نے ردیف کے لحاظ سے میر کا کلام انتخاب کیا ہے۔مولوی صاحب کا یہ مقدمہ خاصا اہم ہے۔اس میں اگر چہ وہ زیادہ تر آزاد کی رائے کے حامی نظر آتے ہیں لیکن وہ میر کے کلام کے متعلق خاصی تفصیل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔اور جس وقت انہوں نے یہ مقدمہ لکھا۔اس وقت تک میر کی تنقید کے سلسلے میں یہ خاصا اہم کام تھا۔اب بھی میر کی تنقید کے لیے یہ بنیادی ماخذات میں سے تصور کیا جاتا ہے۔

حسن عسکری کی مشرقی تنقید خصوصاً اردو تنقید کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔اردو ادب کو عسکری کی صورت میں وہ نقاد ملا ہے۔جس نے تنقید میں مغرب کی تنقید سے بھی استفادہ کیا ہے مگر ان کی تنقید مشرقی فکر اور مشرق کی ادبی روایات سے بھی آگاہ ہے۔انہوں نے میر تقی میر پر بھی تین مضمون لکھے ہیں۔ان میں سے دو مضمون ان کے تنقیدی مجموعہ ''انسان اور آدمی'' میں شامل ہیں جبکہ ایک مضمون ''وقت کی راگنی'' میں شامل ہے۔ان مضامین میں انہوں نے میر کی چند بنیادی مثنوی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔حسن عسکری میر کو غالب سے زیادہ جدید شاعر مانتے ہیں۔وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''ہماری غزل پر غالب کے بجائے میر کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔ اب ہمارے غزل گوئی ذہنی اور روحانی ضرورتیں محسوس کر رہے ہیں۔ جو غالب کی شاعری سے پوری نہیں ہوتی اب ان کے سامنے ایسے مسئلے ہیں جنہیں میر نے زیادہ شدت سے محسوس کیا تھا''۔ (۱۱)

اسی اعتبار سے عسکری میر کو غالب سے زیادہ جدید مانتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ جدید شعراء غالب کے بجائے میر کے لہجے میں زیادہ شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کی وجہ وہی ہو جو عسکری صاحب نے بیان فرمائی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غالب کی بجائے میر کا تتبع زیادہ آسان ہے۔ اور میر کو سمجھنے کے لئے اس ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جو کہ غالب کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ عسکری صاحب کے بقول میر کی روحانی کشمکش کا حاصل یہی ہے کہ اعلیٰ ترین زندگی کو عام ترین زندگی سے ہم آہنگ کیا جائے۔ عسکری صاحب کے بقول میر کو اس بات کا احساس ہے کہ اس کی شخصیت کچھ عجیب سی ہے۔ وہ خود بھی اپنی اس شخصیت کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر کے ہاں عسکری صاحب کو چارہ گر بھی ایک نرم دل اور شفیق انسان کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس میں حقیقت ہے کہ میر نے جس طرح زندگی بسر کی اور زندگی کے گرم وسرد دیکھے۔ تو اتنی زندگی کرنے کے بعد انسان میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور شفقت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اور میر جیسا شخص کہ جس کے دل میں درد لبالب بھرا ہو۔ اسی طرح میر کا عشق بھی کوئی دوسری دنیا کا عشق نہیں ہے اس بارے میں عسکری صاحب رائے دیتے ہیں:

''میر کے عشق کے لئے دنیا میں اور دنیا والوں کے درمیان جگہ موجود ہے۔ میر کے لئے عشق عام انسانی تعلقات سے الگ کوئی چیز نہیں''۔ (۱۲)

عسکری صاحب کی یہ بات تو ٹھیک ہے کہ میر کا عشق عام انسانی عشق ہے۔ اور روائتی طور پر اس میں مافوق الفطرت عناصر نہیں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ میر عشق کو عام معاملات دنیاوی سے علیحدہ اہمیت دیتے ہیں۔ وگرنہ وہ پھر یہ نہ کہتے،

؎ مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

البتہ اتنا ضروری ہے کہ میر اس کو زندگی کا ایک نارمل رویہ سمجھتے ہیں۔ اور زندگی کرنے کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ عسکری صاحب بعض نقادوں کے اس رویہ کو رد کرتے ہیں کہ میر کے ہاں فکر کا عنصر ناپید ہے۔ یا یہ کہ میر کے ہاں تجربات میں تفکر سے زیادہ جذبات کو دخل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زندگی کی حقیقتوں پر غور وفکر کرنا اس تفکر کو احساس کی شکل میں بدلنا۔ ذاتی احساسات کے متعلق معروضی طریقے سے سوچنا پھر اس تفکر اور احساس کو حل کر کے ایک نیا تجربہ تخلیق کرنا یہی تومی کی شاعری ہے۔''(۱۳)

ان سب باتوں پر اتفاق مگر عسکری صاحب کی اس بات سے اختلاف ہے کہ میر کی شاعری غالب سے زیادہ معنی خیز ہے۔ اس لئے نئے غزل گوؤں کی طبیعت کو میر سے ایک فطری علاقہ ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ میر کو لوگ زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غالب کے ہاں معنی آفرینی میر سے کم ہے۔ عسکری صاحب کو میر کے ہاں زندگی کے متعلق جس کیفیت اور شعور کا پتہ چلتا ہے اسی کی طرف بعد میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ ان کے ہاں ایک بھرپور توانائی اور ہمت وحوصلہ ملتا ہے۔ اور اس بات میں صداقت بھی ہے کیونکہ جب کوئی شخص خود مشکل مرحلہ سے گزر کر آتا ہے۔ تو وہ آنے والوں کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ عسکری صاحب نے میر کے نظریہ زندگی کو جامع طور پر قلمبند کیا ہے۔ اور اگر اسی نظریہ کو مطالعہ میر کی بنیاد بنالیا جائے تو میر کو سمجھنے میں خاصی آسانی ہوسکتی ہے۔ اس لئے عسکری صاحب کی اس رائے کی اپنی جگہ بھرپور اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ رائے ایک بنیاد فراہم کرتی ہے۔ مطالعہ میر کے سلسلے میں کوئی بھی قاری یا نقاد اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

مولانا عبدالباری آسی نے کلیات میر تقی میر کا مقدمہ لکھا ہے۔ یہ کلیات میر ۱۹۴۱ء میں جدید ترتیب اور فرہنگ کے ساتھ منشی نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اب تک آسی کا یہ کلیات میر مستند سمجھا جاتا ہے۔ اور اس سے مقدمے کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے میر کے مطالعہ کے لئے بنیادی مآخذ قرار دیتے ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب نے مقدمے میں خاصی تفصیل سے میر کے متنازعہ پہلوؤں پر غور کیا ہے۔ اور کئی اخلاقی باتوں کو اپنی حتمی رائے کی صورت دی ہے۔ اس مقدمے میں انہوں نے میر کی زندگی، آباؤاجداد اور میر کا شاعری کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ یہ مقدمہ اصل میں ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا ہے۔ لیکن شائع یہ کلیات کے ساتھ ہی ہوا۔ مولانا صاحب نے میر کی زندگی کی تمام باتوں کو مرحلہ وار موضوع تنقید بنایا ہے۔ سب سے پہلے وہ ان کے آباؤاجداد کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ اور اسی خیال کے حامی ہیں کہ میر کے آباؤاجداد حجاز سے دکن آئے اور پھر گجرات سے ہوتے ہوئے اکبرآباد آ گئے۔ اس سلسلے میں ''ذکر میر'' کو بنیادی مآخذ بناتے ہیں۔ اس کے بعد سیادت میر کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور اس معاملے پر بحث کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ میر سید ہی تھے۔ اس کے بعد وہ میر کی ولادت کے متعلق اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ وہ میر کی تاریخ پیدائش ۱۱۳۵ھ بتاتے ہیں۔ میر کی بچپن کی تربیت کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ اور اپنے والد سے فیض تربیت حاصل کیا۔ لیکن ان کی رسمی تعلیم نامکمل تھی۔ پھر وہ میر کے دہلی

کے سفر کے متعلق لکھتے ہیں۔ پھر میر کی دلی سے واپسی اکبرآباد اور پھر واپسی دلی کی روداد لکھتے ہیں۔ وہاں پر میر اور خان آرزو کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اس معاملے میں وہ میر کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ میر کی لکھنؤ روانگی اور وہاں پر قیام کے متعلق لکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ میر آخر وقت تک لکھنؤ میں رہے لیکن خوش نہیں رہے۔ میر تقی میر کی عادات اور شخصی اوصاف پر یوں قلم اٹھاتے ہیں:

''جہاں میر صاحب نہایت خوددار، غیور، ظریف، دوست اور دوستوں کے قدردان تھے۔ وہاں ہر کس و ناکس سے اختلاط بھی نہ بڑھاتے تھے۔ ان میں جیسے حسن پرستی کا مادہ ودیعت کیا گیا تھا۔ اسی طرح سے درویش مزاجی اور درویش پسندی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی''۔ (۱۴)

میر کے کلام کے بارے میں وہ عمومی طور پر اسی طرح خراج عقیدت پیش کیا کرتے ہیں جس طرح دوسرے نقادوں یا تذکرہ نگاروں نے یہ کیا ہے۔ انہوں نے میر صاحب کے کچھ اصول شاعری کے متعین کئے ہیں۔ جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں:

''۱۔ میر کے خیال میں شاعری ایک فن شریف ہے۔ ۲۔ شعر کے لیے علمی قابلیت اور معلومات فن کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ ۳۔ شعر میں روزمرہ زبان نہایت صاف ہو۔ ۴۔ شعر میں کوئی خاص اور نادر بات ہو۔ ۵۔ وہی فارسی ترکیب لائی جائے جو زبان پر بار نہ ہو۔ ۶۔ ایہام کا نہایت شستگی اور فنگی سے استعمال کیا جائے۔ ۷۔ تنافر سے کلام کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ ۸۔ شاعر کو محاورے میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ ۹۔ کلام تمام صنائع بدائع کا حامی ہو۔ ۱۰۔ شعر جذبات دل کا آئینہ ہو۔ ۱۱۔ شاعری گل و بلبل تک محدود نہ ہو''۔ (۱۵)

یہ وہ اشیاء ہیں جن کے متعلق میر نے اپنی تنقید و شاعری میں زور دیا ہے۔ اب ان خصوصیات کو مدنظر رکھ کر مولانا صاحب نے میر کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میر صاحب شاعری کے داخلی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مولانا باری نے تجزیہ کر کے میر کے کلام میں جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں،

''کیفیات حسن و عشق واردات محبت حقیقی و مجازی، نفسیات، ندرت بیان و اسلوب آلام و مصائب کے تجربے و بیان، عاجزانہ اور عاشقانہ طنز، تخیل کی بلندی، زبان کی سادگی روزمرہ اور محاوروں کی صفائی، موسیقیت، آورد سے احتراز تلمیحات دلنشیں۔ کہیں کہیں ایہام، فارسی ترکیبوں کا استعمال نازک تشبیہات و استعارات، ہلکے

تصوف کی روش، بیباکی اور صاف گوئی، دلکش اور رواں بحریں، دنیا کی بے ثباتی''۔(۱۶)

یہ وہ فکری وفنی خصائص ہیں جومولانا نے میر کے کلام سے نکالے ہیں اس کے بعد اصناف کا ذکر کیا ہے۔ جن میں غزل، قصیدہ، رباعیات، مخمس ومسدس، ترکیب بند ترجیع بند وساخت ہفت بند مثنویات مدحیات ہجویات اور آخر میں نکات اشعراء اور ذکر میر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ میر کے ایک رسالے فیض میر مجموعہ مراثی اور دیوان فارسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مثنوی میں میر کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ اوران کی مثنویوں میں آمد کی بجائے آورد کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کے مطالعہ کے سلسلے میں نقادوں نے مولانا عبدالباری کے اس مقدمے کے خاصی اہمیت دی ہے۔ اوراس میں شک نہیں کہ یہ ایک جامع اور تنقیدی مقدمہ ہے۔ جس سے مطالعہ میر کے سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ کوئی بھی قاری یا ناقد اس مقدمے سے تنقید میر کے سلسلے میں بنیادی باتیں اخذ کرسکتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری، اردو تنقید کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے۔ انہوں نے شعر ونثر دونوں میں تنقید کی ہے۔ اوران کی تنقید کو اہل ادب حلقے میں کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ میر کے متعلق انہوں نے بھی مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے، ''میر اوران کی شاعری''۔ یہ مضمون ان کی تنقیدی مجموعہ ''تنقیدی حاشیے'' میں شامل ہے۔ یہ ان کی تنقیدی کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے میر کے ساتھ ساتھ دوسرے شعراء پر بھی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں چھپ کر سامنے آئی۔ لیکن یہ مضمون پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کتاب کو ادارہِ اشاعت اردو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں مجنوں گورکھپوری نے میر کی شاعری پر بحث کی ہے۔ اوران کے سوانح کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ انہوں نے میر کو اردو شاعری کا خدا کہا ہے۔ وہ میر کے اس پندار کو درست مانتے ہیں کہ،

؎ ریختہ رتبہ کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

مجنوں گورکھپوری میر کی شاعری کا اجمالاً جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

''میر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے انہوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ترکیب بنداور ترجیع بند بھی لکھے ہیں۔ مسدس، مخمس اور متزاد بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ان کے کلام کو تولئے تو معلوم ہوگا کہ غزل کے علاوہ کسی اور صنف میں کامیاب نہیں رہے''۔(۱۷)

وہ میر کو غزل گوئی کا بادشاہ کہتے ہیں۔ وہ میر کی غزل میں عشق اور واردات محبت کے عناصر زیادہ پاتے

ہیں۔جبکہ حکیمانہ اور فلسفیانہ مضامین کم ملتے ہیں۔وہ میر کی غزل میں رطب و یابس بھی پاتے ہیں۔ان کے خیال کے مطابق میر کے اشعار میں جو غم اور دردمندی ملتی ہے۔وہ بغیر تجربے کے حاصل نہیں ہوسکتی۔وہ میر کی زندگی کے اثرات اوران کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تمام طول کلام کا مطلب یہ نہیں کہ اگر خود میر کو ان آلام عشق اور آفات ارضی و سماوی سے سابقہ نہ پڑتا تو وہ اس قسم کا ایک شعر بھی نہ کہہ سکتے۔لیکن یہ ماننا بھی ہٹ دھرمی ہے کہ اگر عشق اور زندگی کے ہاتھوں میر کا یہ حال نہ ہو چکا ہوتا تو شاید میر وہ میر نہ ہوتے جو آج ہیں''۔(۱۸)

انہوں نے میر کے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء کا موازنہ کیا ہے اور میر جیسی خصوصیات کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی۔اس کے بعد وہ میر کی خصوصیات مثلاً دردمندی،عشقیہ شاعری،طنز،خودداری،کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے۔وہ میر کی غزل کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''ان کے ہاں ان چیزوں کا بہت کم ذکر ہے۔جو کہ اردو شاعری کی روایت میں مثلاً رقیب،بزم یار،بزم غیر،رشک،نامہ بر،شب وصل،بوسہ،معشوق کے سراپا کی تفصیل، مختصر یہ کہ میر نے غزل کو اپنے واردات قلب تک محدود رکھا ہے۔ان کی شاعری محض رسم وروایت پر مبنی نہیں ہے''۔(۱۹)

خواجہ احمد فاروقی نے میر تقی میر پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔جو کہ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔اس کتاب کا نام''میر تقی میر حیات اور شاعری'' ہے۔اس بارے میں خود مصنف لکھتے ہیں:

''میر تقی میر۔حیات اور شاعری ۱۹۴۰ء میں ایک مختصر مقالے کے طور پر شروع کی گئی تھی۔لیکن شوق کی بے پایانی سے پوری ایک کتاب بن گئی۔اور ۱۹۴۵ء کو پایہ تکمیل کو پہنچی''۔(۲۰)

لیکن یہ کتاب بعض وجوہ کی بنیاد پر ۱۹۵۴ء میں چھپ کر سامنے آئی۔یہ بنیادی طور پر میر کے متعلق ایک تحقیقی کام ہے لیکن بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔مصنف نے اس کتاب کے تین حصے بنائے ہیں۔پہلے حصے میں میر تقی میر کی حیات بعد سیرت کے متعلق لکھا ہے۔دوسرے حصے میں میر کی تصانیف نظم کو موضوع بنایا گیا ہے۔اور تیسرے حصے میں تصانیف نثر پر لکھا ہے۔اور آخر میں چند ضمیمے بھی لکھے ہیں۔کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے۔ جس میں میر کے عہد کے حالات کا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔یہ کتاب تنقید میر کی روایت میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔اور اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ ہر آنے والے قاری اور نقاد نے کیا ہے۔اس لئے اس کا مطالعہ خاصا

دلچسپ ہے۔ میر کے اسلاف کے سلسلے میں خواجہ صاحب نے میر کی رائے کو بھی معتبر مانا ہے۔ جو کہ میر نے خودنوشت سوانح عمری میں دی ہے۔ میر کے والد کا نام اور شخصیت کے بارے میں بھی خواجہ صاحب نے میر کی اپنی رائے کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

خواجہ صاحب نے میر کے والد صاحب کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ آگے چل کر انہوں نے سید امان اللہ جو کہ میر کے منہ بولے چچا تھا۔ ان کی زندگی اور میر پر ان کے اثرات کے حوالے سے بات کی ہے۔ خواجہ صاحب کے مطابق میر نے سید امان اللہ کی تربیت وصحبت کا خاصا اثر لیا۔ اور ان کے انتقال پر میر کو خاصا رنج بھی ہوا۔ خواجہ صاحب نے میر کی سیادت کو تسلیم کیا ہے۔ میر کے مذہب کے بارے میں خواجہ صاحب کی رائے یہی ہے کہ ان کے دل میں جناب مرتضٰی علی اور امام تشنہ کام کی خاص محبت تھی۔ بہر حال خواجہ صاحب کے مطابق وہ شیعہ مذہب تھے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے میر کے دہلی کے سفر اور وہاں پر رہنے کے متعلق لکھا ہے۔ خواجہ صاحب کے مطابق جب میر دلی آئے تو ان کی عمر اس وقت سترہ برس سے کم تھی۔ خواجہ صاحب نے میر کی تربیت میں خان آرزو کے کردار کو مانا ہے۔ خواجہ صاحب کے مطابق میر نے ۱۹ برس کی عمر سے پہلے شاعری شروع کر دی تھی۔ خواجہ صاحب نے میر کی دیوانگی کے متعلق بھی لکھا ہے۔ کہ وہ دیوانے رہے اس کی وجوہات وہ خان آرزو سے اختلافات، زمانے اور معاش کے حالات ذہنی پیچیدگی جنسی محبت اور وراثت بتاتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے تفصیل کے ساتھ میر کے عہد میں ہونے والے سیاسی داؤ پیچ کی کہانی بتائی ہے۔ میر نے جتنے سفر کئے اور جہاں پر ملازمت کی اس کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ دلی میں میر کی زندگی کا جو حصہ گزرا اس کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ میر کی لکھنؤ روانگی اور وہاں پر قیام کے بارے میں بتاتے ہیں۔ میر کے لکھنؤ میں قیام کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''آصف الدولہ کے دربار میں میر کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔ اور وہ ان کو اتنے عزیز تھے کہ سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے''۔ (۲۱)

خواجہ صاحب اس معاملے میں آزاد اور دوسرے تذکرہ نگاروں کی تائید کرتے ہیں۔ کہ میر صاحب بد دماغ اور نازک مزاج تھے۔ میر کی لکھنؤ میں یاد دلی کا ذکر بھی خواجہ صاحب نے کیا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن دلی کی پسندیدگی اور لکھنؤ سے بیزاری کے پیچھے میر کی بد دماغی یا نازک مزاجی کا حوالہ دینا اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ یہ نقطہ کہ دلی میں میر کی زندگی کا خاصا حصہ گزرا تھا۔ پھر میر کو دلی سے جذباتی وابستگی بھی تھی۔ اس لئے بھی وہ لکھنؤ کی بجائے دلی کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے میر کی اولاد اور شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ میر کے ایک بیٹے میر عسکری جو کہ عرش تخلص کرتے تھے۔ خاصا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میر کے دوسرے بیٹے کا نام میر فیض علی تھا۔

میر صاحب کی ایک بیٹی کا ذکر کیا ہے۔ میر کے شاگردوں کے بارے میں بھی خواجہ صاحب کی عمومی رائے وہی ہے کہ ان کے شاگرد کم تھے۔ اس کی وجہ وہ یہی بتاتے ہیں کہ میر کی شاگردی کرنا آسان نہ تھی۔ خواجہ صاحب میر کی شاعر کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''میر کے انداز میں اگر غور سے دیکھا جائے تو تجنیس، ترصیح، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، یہ تمام خصوصیات پورے طور پر موجود ہیں۔ وہ شاعری کو فن شریف سمجھتے تھے۔ اور اس کے لیے علمی قابلیت اور سلیقہ شاعرانہ کو ضروری خیال کرتے تھے''(۲۲)

یہ وہ خصوصیات ہیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے خواجہ صاحب نے میر کی شاعری کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا ہے۔ زبان وہ بنیادی عنصر ہوتا ہے جو کسی بھی صنف کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ میر کے ہاں جو زبان ملتی ہے۔ وہ خواص اور عوام دونوں میں یکساں مقبول تھی۔ اس بارے میں خواجہ صاحب رقمطراز ہیں:

''میر نے محاورہ کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ ان کی زبان کھڑی بولی کی نکھری شکل ہے۔ اس میں ہندوستانی عناصر ہیں۔ اس کا تعلق عوام سے بہت گہرا ہے۔ لیکن اسے خوش مزاجی اور سلیقہ کی چھلنی میں چھانا گیا ہے''۔(۲۳)

خواجہ صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ میر کے ہاں متنوع مضامین ملتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے میر کی غزل پر بحث کرتے ہوئے ان کی غزل کہ خصوصیات پر الگ الگ بحث کی ہے۔ انہوں نے میر کی غزل کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں، داخلیت، خارجیت، تصور حسن و عشق، فلسفہ غم، آرٹ، شیوہ گفتار، سادگی و پرکاری، ندرت، نشتریت، سہل ممتنع، سلیقہ، الفاظ و معنی کا توازن، ایجاز، اجزائے کلام کی اصلی ترتیب، محاورہ بندی، طنز، تشبیہ و رمزی علامات، موسیقیت، ترکیبیں، ہندوستانیت، فلسفہ، زیست و اخلاق، دنیا اور کائنات کی صورتحال، انسان کی عظمت، شوق منزل اور ہمت ہیں۔ ان تمام خصوصیات کا خواجہ صاحب نے بڑے مفصل انداز سے جائزہ لیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ مناسب اشعار کی مثالیں دی ہیں۔ وہ میر کی غزل کا اجمالاً جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

''تغزل کے میدان میں میر کی ہمسری کا دعویٰ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ میر کی افتادگی و دل سوزی، خستگی و برجستگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی ہے''۔(۲۴)

خواجہ صاحب نے میر کے قصائد پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ میر نے اگرچہ زیادہ قصائد نہیں لکھے۔ اور نہ ہی انکا قصائد نگاری میں وہ مقام ہے جو مرزا سودا کا ہے۔ لیکن اس زمانے کی مقبول صنف ہونے کی وجہ سے میر نے بھی

اس میں طبع آزمائی کی۔اگرچہ میر کے قصائد کی زبان اور ادابندی کی خواجہ صاحب نے تعریف کی ہے۔لیکن انہیں میر کے ہاں فنی خامیاں نظر آتی ہیں۔خواجہ صاحب میر کی مثنویوں کے بارے میں مجموعی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''میر کی وہ مثنویاں جن میں کتے، بلی، بکری، اور مرغ وغیرہ کے قصے ہیں ندرت سے خالی نہیں۔ان کی عشقیہ مثنویوں کی زبان ضرور قدیم ہے''۔(۲۵)

محمد حسین آزاد سے لے کر خواجہ احمد فاروقی تک تنقید میر کی روایت کا یہ مختصر اور سرسری مطالعہ ہے۔یقیناً اس مطالعے میں کئی مزید نام شامل ہو سکتے ہیں۔علاوہ ازیں متذکرہ بالا ناقدین کے ہاں میر شناسی کے کئی پہلو ابھی وا ہونا باقی ہیں۔میر شناسی کی روایت بہت طویل اور ضخیم ہے۔اس طویل روایت میں سے یہ منتخب مطالعہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، لاہور: مجلس ترقی ادب۱۹۷۲ء، ص۶۲۵

۲۔ سید عبداللہ، نقد میر، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۸ء، ص۲۸۴

۳۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۱۷۱

۴۔ ایضاً، ص۱۷۵ ۵۔ ایضاً، ص۱۷۶ ۶۔ ایضاً، ص۱۷۸

۷۔ سید امداد اثر، کاشف الحقائق، مرتبہ: ڈاکٹر وہاب اشرفی، نیو دہلی: اردو بیورو، ۱۹۸۲ء، ص۴۱۶

۸۔ ایضاً، ص۵۶۰

۹۔ مولوی عبدالحق، انتخاب کلام میر، لاہور: لاہور اکیڈمی، ص۱۳

۱۰۔ ایضاً، ص۱۶

۱۱۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز۱۹۹۴ء، ص۱۵۲

۱۲۔ ایضاً، ص۱۵۷ ۱۳۔ ایضاً، ص۱۶۲

۱۴۔ میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ مولانا عبدالباری آسی، لکھنؤ: نول کشور، ۱۹۴۱ء، ص۳۶

۱۵۔ ایضاً، ص۴۲ ۱۶۔ ایضاً، ص۴۴

۱۷۔ تنقیدی حاشیے۔مجنوں گورکھپوری۔ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن ۱۹۴۵ء۔میر اور ان کی شاعری۔ص۔۱۱

۱۸۔ ایضاً، ص۲۶ ۱۹۔ ایضاً، ص۵۱

۲۰۔ مولوی عبدالحق، میر تقی میر حیات و شاعری، علی گڑھ: انجمنِ ترقی اردو ہند، جولائی ۱۹۵۴ء، ص۱۳

۲۱۔ ایضاً، ص۲۴۹ ۲۲۔ ایضاً، ص۳۱۸ ۲۳۔ ایضاً، ص۳۲۰

۲۴۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر حیات و شاعری، علی گڑھ: انجمنِ ترقی اردو ہند، جولائی ۱۹۵۴ء، ص۳۲۱

۲۵۔ ایضاً، ص۴۳۱